۱۵ / مارچ ۱۹۷۱ء

اس شمارے میں

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۱۱

اداریہ

رسم خط کے سلسلے میں

چند اور باتیں

اِدھر دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے رسم الخط کے مسئلے پر ایک سیمنار ہوا۔ اس کے علاوہ چند دن ہوئے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں اس موضوع پر ایک مذاکرہ بھی نشر کیا گیا۔ یہ بات تو اب اخباروں میں مضامین، سیمنار کے مقالات اور ریڈیو کے مذاکرے سے واضح ہوگئی ہے کہ اردو دوست مجموعی طور پر رسم الخط میں کسی تبدیلی کے خلاف ہیں، لیکن بعض حلقوں میں دبی زبان سے ضرور پوچھا جاتا ہے کہ اگر تبدیلی کرنا ہو تو پھر دیوناگری یا رومن میں سے کس کو اختیار کیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ غلط زاویۂ نگاہ ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کونسا رسم الخط بہتر ہے۔ دنیا کا کوئی رسم الخط مکمل نہیں ہے۔ بین الاقوامی صوتیاتی ایسوسی ایشن (IPA) نے رومن رسم الخط میں اشارات وعلامات کا اضافہ کرکے اسے اس قابل ضرور کر دیا ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی آوازوں کو ادا کر سکے، مگر یہ رسم الخط صرف ماہرین کے لئے رہے گا۔ عام لوگ نئے اشارات اور علامات یاد رکھنے اور لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے۔

اس وقت دنیا میں جتنے رسم الخط رائج ہیں اُن میں سے ہر ایک میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی، یہ بات کہ فلاں رسم الخط زیادہ تعداد میں لوگ استعمال کرتے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ اگر لوگ صرف اکثریت کو دیکھا کرتے اور اس کے مطابق اپنے کو ڈھال لیا کرتے تو اقلیتوں کے حقوق کا سوال ہی نہ اُٹھتا۔ یہ بات بھی اہم نہیں ہے کہ دنیا میں یکسانیت یا ملک میں یکسانیت کی خاطر کوئی رسم الخط اختیار کر لیا جائے۔ دنیا کو یا ملک کو اس قسم کی مصنوعی اور زبردستی کی یکسانیت کی نہ ضرورت ہے نہ یہ کسی طرح ممکن ہے۔ گو یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ زبان اور رسم الخط کا کوئی بنیادی اور لازمی رشتہ نہیں ہے اور ایک زبان کسی ترقی یافتہ رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے، مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رشتہ ہو جاتا ہے اور ہوا ہے اور ہوتا ہے کیونکہ اوّل تو مروجہ رسم الخط میں جس طرح پوری زبان اور پورے ادب کے خزانے تک رسائی ہوتی ہے اس طرح نئے رسم الخط میں نہیں ہو سکتی، دوسرے زبان میں جو نفسیاتی علاقہ اور پوری شخصیت کو کام میں لانے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ اس مروجہ رسم الخط میں ممکن ہے۔ دوسرے نئے رسم الخط میں اس زبان کے بولنے والے نئے سرے سے ذہنی زندگی شروع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی مثال اُن دوڑنے والوں کی

ہوتی ہے۔ جنھیں ایک کمی (HANDICAP) کے تحت دوڑنا یا اُن جیم بازوں کی جنھیں پہاڑ پر زیادہ بوجھ لیکر چلنا پڑے۔ اس لئے ہمارے نزدیک اس سلسلے میں یہ سوال اٹھانا غیر ضروری ہے کہ تبدیلی کرنا ہو تو کیا کیا جائے۔ جو لوگ اس قسم کی بات کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک کسی نہ کسی بے یقینی کے شکار ہیں۔ اپنی زبان اور اپنے رسم الخط سے مکمل وفاداری ضروری ہے۔ اس کا مقصد علیحدگی پسندی کو تقویت دینا یا ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا نہیں، بلکہ اپنے پورے قد کو پہچاننا، اپنی ساری میراث سے کام لینا، اپنی روایت کو برتنا اور اپنی ساری اعصابی توانائی کی مدد سے موجودہ دور کی کشمکش میں اپنی جگہ بنانا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کا جو سوال ادھر اٹھایا گیا ہے وہ ایسے لوگوں کی طرف سے جو اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال کہ اگر دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیا گیا تو اردو زبان کی مقبولیت کی وجہ سے اس کی ساری آوازیں دیوناگری میں رفتہ رفتہ استعمال ہونے لگیں گی، خیال خام ہے۔ دیوناگری سے اردو کی مخصوص آوازوں کو خارج کر دیا گیا، نقطے ہٹا دئے گئے۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ انھیں دوبارہ رائج کیا جا سکے۔ ایک لنگڑی لولی اردو تو دیوناگری رسم الخط میں آ جائے گی، مگر میر و غالب کی زبان، نظیر اور انیس کی زبان، میر امن، سرشار، سر سید، حالی، اقبال، ابوالکلام آزاد، فراق اور فیض کی زبان، اپنی جامعیت، شادابی، تھرتھراہٹ، لہجے کی اثر انگیزی اور ذہن میں شمعیں جلانے کی طاقت سے محروم ہو جائے گی۔ ہمارے دستور سازوں کے ذہن میں یہی بات تھی جس کی وجہ سے انھوں نے زبان کے ساتھ رسم الخط کی بھی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔ یہ دستوری ضمانت بہت بڑی چیز ہے۔ جدید تدریسی ضروریات یا طباعتی ضروریات کے لئے جو اصلاح ضروری ہو وہ کرنا چاہئے، مگر رسم الخط میں تبدیلی کی بات نہیں کرنی چاہئے۔ حالیہ انتخاب نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہندوستان کے عوام جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم پر یقین رکھتے ہیں، ملک میں ایک مضبوط مرکز چاہتے ہیں۔ وہ غریبی کو دور کرنا چاہتے ہیں اور تمام پس ماندہ طبقوں کو اونچا اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ مذہبی تنگ نظری اور علیحدگی پسندی کے خلاف ہیں۔ وہ اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں اور ان کی بے اطمینانی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اردو دوستوں کو اس موقع پر نہایت فخر و اعتماد کے ساتھ اپنی زبان اور رسم الخط کے ساتھ مکمل وفاداری کا ثبوت دینا چاہئے اسی کے ذریعے سے وہ اپنے اور اپنے ملک کے لئے مفید ہو سکیں گے۔ آج ہمیں زبان کے معاملے میں ایک یقین محکم کی جتنی ضرورت ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ یہی یقین محکم ہمیں عمل پیہم کی طرف لے جا سکتا ہے اور اسی سے وہ محبت پیدا ہو سکتی ہے جو فاتح عالم بن جائے۔

ارشد لکھنوی کا انتقال

۲۲ر فروری ۱۹۷۱ء۔ آج کی رات ۲ بجکر بیس منٹ پر کلکتہ کے ایک گمنام غیر مطبوعہ صوفی شاعر جناب سید محمد عبدالرشید صاحب ارشد لکھنوی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم عربی، فارسی اور اردو تینوں زبان میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ عنقریب منظر عام پر آئے گا۔ (س۔ م۔ اقبال)

اصلاحِ شعر و سخن

ہمارے ادارہ "تاج الادب" نے نئے لکھنے والے حضرات کے مضامین نظم و نثر کی اصلاح کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کیا ہے۔ جس میں ہندوستان کے اچھے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔

لہذا جو حضرات اپنے مضامین نظم و نثر کی اصلاح کے طالب ہوں حسب ذیل پتے پر ۲۵ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر قواعد و ضوابط ادارہ ہذا سے حاصل فرمائیں۔

عرفان تبسم ناظم امور اصلاح ادارہ "تاج الادب" کلکتہ
قصر اردو ۱۲۸ اردو بازار جامع مسجد دلی ۶

اطہر پرویز

موریشس میں اردو زبان کا جائزہ

جناب اطہر پرویز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں استاد ہیں، حکومت ہند کی طرف سے ڈھائی سال کے لئے اردو کی تدریس کے لئے موریشس گئے تھے یقین ہے کہ ان کے تاثرات، ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ (ادارہ ہماری زبان)

موریشس کو بحر ہند کی کنجی اور اس کا تارا بھی کہتے ہیں لیکن مارک ٹوین کے نام سے یہ جملہ منسوب ہے کہ خدا نے پہلے موریشس کو بنایا اور پھر اس کے نمونے پر جنت کی تشکیل کی لیکن سچ پوچھئے تو یہ ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے جو ہندوستان سے تقریباً تین ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔

یہ چھوٹا سا لیکن خوبصورت اور صاف ستھرا جزیرہ ہندوستانی تہذیب کے نمونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لئے کہ موریشس کے عوام کی تاریخ ہندوستانی تاریخ سے آکر جڑ جاتی ہے۔ موریشس کی ۵۰ فیصد سے زیادہ آبادی ہندوستانی نژاد ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے آبا و اجداد آج سے سو برس پہلے ہندوستان چھوڑ کر موریشس میں آکر بس گئے تھے اور پھر انھوں نے اس جزیرے کے خد و خال کو ابھارا، اس کے حسن کو نکھارا۔ آج اگر یہ جزیرہ اور اس کے ساحل اتنے خوبصورت نظر آتے ہیں تو اس میں ان ہی بزرگوں کا ہاتھ ہے۔ ان کے ماتھے کا پسینہ اس کی دھرتی میں جذب ہے۔ یہ لوگ انڈو موریشین کہلاتے ہیں جو زیادہ تر کاشتکاری کرتے ہیں اور گنے کے سرسبز و شاداب کھیت ان کی محنت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

یہ وہ جزیرہ ہے جس پر کبھی وہ پرندہ چلتا پھرتا تھا جس کا نام ڈوڈو تھا۔ اور آج اس پرندے کا نام صرف کتابوں اور لوگوں کی زبانوں پر محفوظ ہے۔

اس جزیرے پر باری باری ڈچ، فرانسیسی اور برطانوی سامراج کی حکومت رہی۔ برطانوی سامراج نے ۱۵۸ سال تک حکومت کی۔ آخر ۱۲ر مارچ ۱۹۶۸ء کو یہ جزیرہ آزاد ہو گیا۔

ہندوستانی نژاد ماریشین اس جزیرے کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ یہ لوگ کوئی معقول سوغات نہ لا سکے جو آنے والے دنوں میں ان کی اولاد کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی البتہ وہ اپنے ساتھ اپنی زبان اور اپنا تہذیب و تمدن ضرور لائے اور انھوں نے اس کا بیج اس مٹی میں گاڑ دیا۔ سو سوا سو سال کے بعد جب اس مٹی کی آبیاری کی تو اس پودے نے اپنا سر نکالا۔ ہندوستانیوں کی بدولت اس جزیرے میں فرانسیسی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانیں بھی سنائی دینے لگیں۔ لیکن اس میں زیادہ تر مذہبی جذبہ کارفرما تھا کیونکہ یہ زبانیں تبلیغ کا سہارا تھیں۔

۱۹۵۴ء میں حکومت نے پرائمری اسکولوں میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی، اردو، تلگو، تامل اور مراٹھی تعلیم بھی لازمی کردی ہے۔ اس طرح ۱۹۷۰ء کے تعلیمی گوشوارے کے حساب سے ان زبانوں کے پڑھنے والوں کا تناسب مندرجہ ذیل ہے:-

ہندی	اسکول ۱۶۵	طلبہ و طالبات ۴۰ ہزار	اساتذہ ۴۰۰	ٹریننگ کالج ۴۱
اردو	״ ۱۰۴	״ ۲۸ ״	״ ۱۸۱	״ ۴۴
تامل	״ ۹۶	״ ۱۰ ״	״ ۸۴	״ ۱۲
تلگو	״ ۲۷	״ ۳ ״ ۳۲۰	״ ۳۹	״ ۸
مراٹھی	״ ۱۲	״ ۱ ״ ۳۲۲	״ ۱۴	״ ۷

استادوں کی تعداد، طلبہ کی تعداد کے تناسب سے مقرر کی جاتی ہے۔ سو طالب علموں پر ایک استاد کا تقرر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیچرز ٹریننگ کالج میں ہر سال ان زبانوں کو پڑھانے کے لئے تربیت دی جاتی ہے ان استادوں کا انتخاب وزارت تعلیمات خود کرتی ہے اور امیدواروں میں سے جن طلبہ کا انتخاب کرلیتی ہے پھر ان کا تقرر

عبدالمتین نیاز

غزل

کہتے ہیں زندگی جسے خوابوں میں ڈھونڈیئے
آسودگی کی بات کتابوں میں ڈھونڈیئے

سب پھول کھل کے زرد ہوئے اس بہار میں
سرخی لہو کی اب نہ گلابوں میں ڈھونڈیئے

جو کھو گیا خلاؤں میں آواز کی طرح
اس "میں" کو اب بدن کے سرابوں میں ڈھونڈیئے

ممکن ہے کوئی نقش نیا ذہن پہ بنے
تعبیر ہر خیال کی خوابوں میں ڈھونڈیئے

کچھ تجربے بھی کیجئے لذت اسی میں ہے
ہر بات کو نہ آپ کتابوں میں ڈھونڈیئے

کیجے تلاش آپ حقائق کی بزم میں
چہرہ نہ زندگی کا نقابوں میں ڈھونڈیئے

جو خود پہ طنز کر کے بھی ہنستے ہوں اے نیاز
انسان ایسے خانہ خرابوں میں ڈھونڈیئے

ہو جاتا ہے۔ ان کو ایک سال تربیت دینے کے بعد اسکولوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ٹریننگ کالج میں میرے دورانِ قیام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل جناب احمد قاسم میرا بی اے، بی ایڈ کا تقرر ہوا، جو ان دنوں تنہا اس ذمہ داری کو سنبھال رہے ہیں۔ استادوں کی تنخواہ ہندوستانی سکے کے مطابق تقریباً ۳۰۰ روپے سے شروع ہوتی ہے اور تقریباً ۷۷۵/- روپیہ تک جاتی ہے۔ اس میں اضافے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔

جزیرے میں مختلف علاقوں میں اردو کی انجمنیں اور تنظیمیں پابندی سے اپنا کام کر رہی ہیں۔ بچوں کی انجمن بلبلین مائیاں؛ ماریشس اردو اکیڈمی پیٹل؛ بزم ادب، کیورپیپ؛ مسلم اردو لٹریری سرکل کا نجاب؛ اور مجاز لٹریری کلب، ریویرے دیکھنز؛ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مسلم اردو لٹریری سرکل کا نجاب کا رسالہ اور جناب عبدالعلیم بخشو کا رسالہ شمعِ وطن، واکوا۔ یہ دونوں رسالے سائکلو اسٹائل پر چھپتے ہیں۔ اس لئے کہ ابھی تک اردو کی باقاعدہ طباعت کا کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔

ابھی حال ہی میں ایک مرکزی ادارہ کا قیام عمل میں آیا ہے، نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ۔ اس کا افتتاح وزیر اعظم سر شیو ساگر رام غلام کی موجودگی میں گورنر جنرل کے ہاتھوں عمل میں آیا اس کی صدارت ائر انڈیا کے جنرل منیجر جناب پی۔ بی۔ دھرنے کی۔ اس جلسے میں وزرائے کابینہ اور اکابرینِ قوم کے علاوہ روس، انگلستان، امریکہ، فرانس، مڈگاسکر، ہندوستان اور پاکستان کے سفیروں نے شرکت کی۔

اس انسٹی ٹیوٹ کے عمل میں آنے میں جزیرہ کے متعدد رہنما آنریبل سر عبدالرزاق محمد منسٹر آف لینڈ اینڈ ہاؤسنگ کے علاوہ ممتاز صنعت کار جناب عبداللہ کریم جی، مسٹر اسحاق جوناس ڈاکٹر نکیم ایڈیٹر استار روزنامہ، مسٹر دادودا، جناب احمد عبداللہ احمد کھترادا، آنریبل یوسف محمد، جناب حیات اللہ، ڈاکٹر جمیل فرید، جناب سلیمان بھاباتا نے خاص طور پر دلچسپی لی۔

وزیر اعظم سر شیو ساگر رام غلام اور سر عبدالرزاق محمد اس کے سرپرست ہیں۔ اردو کے ساتھ سر عبدالرزاق محمد کی والہانہ محبت اردو کے روشن مستقبل کی ضامن ہے۔ موصوف خود اردو بولتے ہیں اور جزیرے کی ہر اردو تحریک سے وابستہ ہیں اور قدم قدم پر اردو کا ساتھ دیتے ہیں۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اردو کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ ان کی بدولت نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ اپنی منزلِ مقصود پر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی مدد سے جزیرے میں بہت سی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا ہے اور یہ تمام انجمنیں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ سے مرکزی طور پر وابستہ ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں اردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے۔ یہاں جامعہ اردو کے مختلف امتحانات کی پڑھائی بھی ہوتی ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک مرکزی لائبریری بھی ہے جس میں ہندوستانی سفارت خانے نے بڑی تعداد میں کتابیں دی ہیں۔

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں یوم سرسید، یوم مجاز اور یوم غالب کی تقریبات بھی بڑے پیمانے پر منائی گئیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل ایک ماریشین مسٹر عنایت حسین عیدن ایم۔ اے علیگ اس انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری مقرر کئے گئے ہیں اور ممتاز صنعت کار جناب عبداللہ کریم جی اس کے صدر اور روحِ رواں ہیں۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کا ایک اردو خبرنامہ بھی ہے جو "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے سائکلو اسٹائل سے نکلتا ہے۔

جامعہ اردو کے امتحانات جزیرے میں بے حد مقبول ہیں کیونکہ پرائمری اسکولوں کے اردو استادوں کے تقرر کے لئے ایک اردو سرٹیفکٹ لازمی ہے۔ پچھلے سال تقریباً ایک ہزار طلبہ نے ان امتحانات میں شرکت کی۔ لیکن ان امتحانات کے معیار اور اس کے نصاب سے حکومت اور عوام دونوں کو شکایت ہے۔ اور اخباروں کے ذریعہ حکومت پر دباؤ پڑ رہا ہے کہ ان امتحانات کو اب تسلیم نہ کیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ جامعہ اردو کے نصابات ماریشس کے لئے ناموزوں ہیں۔ کیونکہ جو طالب علم ٹھیک سے اردو نہ پڑھ سکتے ہوں، ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اردو کی قدیم کلاسیکس لسانی و ادبی تاریخ سے استفادہ کر سکیں گے، بے سود ہے۔ نیز یہ کہ جب ان کو پڑھانے والے بھی اپنے حدود رکھتے ہوں۔ میں نے اپنے تجربے کے پیش نظر جامعہ اردو کے اکابرین کے سامنے ان امتحانات کے نئے نصاب کے سلسلے میں ایک تجویز رکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر یہ تجاویز منظور ہو گئیں تو جامعہ اردو کے امتحانات کو عزت بھی ملے گی اور اس سے طالب علم بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ کیونکہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ طلبہ امتحانات بھی پاس کر لیتے ہیں لیکن ان کی علمی لیاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ امید ہے کہ جامعہ اردو اس معاملے میں دلچسپی لے گی اور میری آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔

جامعہ اردو کے امتحانات کے علاوہ سینیر کیمبرج اور لندن یونیورسٹی کے جنرل سرٹیفکٹ آف ایجوکیشن کے امتحانات میں اردو کے پرچے بھی شامل ہیں۔ ان امتحانات کے پرچوں کا معیار تو اچھا نہیں ہے لیکن ان کا وقار اپنی جگہ ہے اور اب حکومت ان امتحانات کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

اس وقت جزیرے میں اردو تحریک بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور یہ مانگ زور پکڑ رہی ہے کہ ثانوی اسکولوں میں اردو

کی تعلیم شروع کردی جائے۔ اس وقت جزیرے میں جو چند اساتذہ ان سرگرمیوں میں آگے آگے ہیں ان میں جناب حسن محسن، جناب عبدالعلیم بخش، جناب عبدالرحیم پاردلی، جناب گل حمید بگن، محمد طاہر ددمن، محمد شاکر بگن، جناب ہدایت علی، عبدالعزیز بگن، سید حمت اللہ، الیاس نور محمد، عبدالقادر محمد گوگا، احمد بنجارہی، مس امینہ رحم علی، مس ریحانہ بچو، عبدالرافع احمدی، عبدالصمد احمدی، عبدالحمید رام جیت، عبدالکریم اور صابر گودر وغیرہ۔

جناب گل حمید بگن اردو سے والہانہ محبت رکھتے ہیں اور برابر تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں انھوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ اخباروں میں اردو سے متعلق مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ جناب حسن محسن صاحب تصنیف و تالیف سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کی دو کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں اردو زبان دانی قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کتاب "فضول خرچی باعث تنزل" لکھ رہے ہیں۔

جناب عبدالرحیم پاردلی شعر بھی کہتے ہیں اور بہت پرانے استاد ہیں پچھلے اگست میں محبانِ اردو نے ان کی پچاس سالہ سالگرہ بڑے زور شور سے منائی جس میں ملک کے مقتدر حضرات نے شرکت کی۔

موریشس براڈکاسٹنگ کارپوریشن (M.B.C) کے ریڈیو اسٹیشن سے ہندوستانی پروگرام بڑی پابندی سے نشر ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام صبح ۷ بجے سے ۸ بجے تک اور دن کو ۱۲ بجے سے ۲ بجے تک نشر ہوتے ہیں۔ اس میں عام طور پر ہندوستانی فلمی گانے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہندوستانی زبانوں کے ادبی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔

جناب رام لکھن صاحب ہندوستانی پروگرام کے خاص نگراں ہیں۔ اردو پروگرام کی ذمہ داری جناب عبدالباقی احمدی کے سپرد ہے۔ اس کام میں جناب ایوب پیر علی اور عبدالسلام احمدی ان کی مدد کرتے ہیں۔

مولانا محمد ابراہیم خوشتر جامع مسجد کے پیش امام ہیں۔ وہ ہر جمعہ کو اپنا خطبہ اردو میں پیش کرتے ہیں جو ریڈیو سے پابندی سے نشر کیا جاتا ہے۔ مولانا خوشتر کی تقاریر قومی یک جہتی کی روشنی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ عید اور بقرعید کا خطبہ پورے موریشس میں بڑے شوق سے سنا جاتا ہے۔ ٹیلی وژن پر پیر، بدھ، جمعرات اور سنیچر کو ہندوستانی پروگرام ہوتا ہے۔ اور جمعرات کو ایک ہندوستانی فلم دکھائی جاتی ہے۔

موریشس میں ہندوستانی فلمیں اور ہندوستانی فلمی گانے بے حد مقبول ہیں۔ عام طور پر تین ہندوستانی فلمیں ایک ساتھ سینما ہال میں دکھائی جاتی ہیں اور شرح ٹکٹ اوسطاً ایک روپیہ ہے۔ ان فلموں کی نمائش سے بھی اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں بڑی مدد ملی ہے۔

جزیرے میں اردو کتابوں کی تین بڑی دوکانیں ہیں۔ اوسطاً سالانہ ستر ہزار روپیہ کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔

میرے دوران قیام میں مذکورہ بالا تمام حضرات نے ہر طرح میرے ساتھ تعاون کیا اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لی۔

جناب احمد قاسم ہیرا (ایجوکیشن آفیسر، وزارت تعلیمات) اور جناب عنایت حسین عیدن (جنرل سکریٹری نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ) اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں خاص طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔

موریشس میں ہر سال اردو ہفتہ، یوم اقبال اور یوم غالب کی تقریبات بڑے پیمانے پر منائی جاتی ہیں جن میں وزرائے حکومت کے علاوہ دوسرے ممالک کے سفرا اور دیگر اکابرین شرکت کرتے ہیں۔ یہ تقریبات جزیرے کے کونے کونے میں منعقد ہوتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ موریشس میں اردو زبان کا مستقبل خاصا روشن ہے اور اس کی مقبولیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔

باقی صفحہ ۶ سے آگے

استعمال کرسکیں گی۔ ملک کی رجعت پرست طاقتوں کا زور کم کرنے کے سلسلے میں کچھ دن اور اسی انداز کی مفاہمت ہوتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہم ہندوستانی تاریخ کی کتابوں میں خود اپنے ہندوستان کو نہ پہچان سکیں۔ لہٰذا ہم اہل قلم ایمانداری کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو زبان کو اس کی اپنی موجودہ رسم خط میں ہی زندہ رہنا چاہیے۔ اس میں کسی طرح کی بنیادی تبدیلی زبان و ادب کو تہ تیغ کرنے کے مترادف ہے جو ایک بھیانک قومی المیہ سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔

دستخط کنندگان

غلام فخرالدین شاد، قتیل داناپوری، انیس امام، چندر بھوشن تیواری، امانی ندوی، ظفر رضوی کاکوی، مدھوکر سنگھ، نسیم محمد جان، علیم اللہ حالی، ظفر رضوی برق، ایم۔ اے۔ حفیظ فارسی، تاج پیامی۔

• انیس امام

اردو زبان اور رسم خط

آرہ میں مقیم ہندی اور اردو ادیبوں کا مشترکہ بیان

ہم ہندی اور اردو کے اہل قلم اردو زبان کی رسم خط کے سلسلے میں اٹھائی گئی بحث کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو زبان جس رسم خط میں وجود میں آئی اور پروان چڑھی اسی رسم خط میں اسے زندہ رہنا چاہیے اس لئے کہ اس کی یہی زندگی ملک کے رجعت پرست عناصر اور مفاد پرست سیاست دانوں کا موزوں ترین جواب ہو سکتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جس زبان کو اس کے مصلحت پسند ہم نواؤں اور فرقہ پرست دشمنوں نے کسی زمانے میں ہندی کی ایک اسٹائل کہہ کر اس کی عظیم مقبولیت کو کم کرنے کی سازش کی آج وہ اسے کسی صورت برداشت کرنے کو بھی تیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو کو انھوں نے فارسی رسم خط میں ہی (جو اب اس کی اپنی رسم خط بن چکی ہے) ہندی کی ایک اسٹائل تسلیم کیا تھا۔ حالانکہ لسانی اعتبار سے اردو، ہندی اور پنجابی تینوں سگی بہنیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنا الگ الگ مقام اور علیحدہ رسم خط رکھتی ہے۔ البتہ یہ خصوصیت پنجابی کی رہی کہ ایک زمانے تک گورمکھی اور فارسی دونوں رسم خط میں لکھی جاتی رہی۔ صوتیات (PHOENETICS) اور ادبی سرمایہ ہر دو اعتبار سے اردو کا درجہ قابل رشک ہے۔ جو لوگ اردو رسم خط کی تبدیلی کے جواز میں انگریزی زبان کی رسم خط کی تبدیلی کی مثال پیش کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ لاطینی اور رومن رسم خط میں صرف آرائش کا فرق ہے ہیئت (STRUCTURE) کا فرق کچھ زیادہ نہیں جبکہ اردو اور دیوناگری رسم خط میں ہیئت (STRUCTURE) کا بنیادی فرق ہے اور دونوں کا سفر دو متضاد سمتوں میں ہوتا ہے۔ ہم مطالعہ اور تجربے سے یہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی رسم خط سو فیصد سائنٹفک نہیں۔ دیوناگری اگر ٹائپ کے معاملہ میں سائنٹفک ہے تو اردو تحریر کے معاملہ میں شارٹ ہینڈ ہے اور زیادہ سائنٹفک۔ ہر رسم خط کی الگ الگ خوبیاں ہیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اردو میں آوازوں کی ادائیگی کے لئے جتنی علامتیں (SYMBOLS) پائی جاتی ہیں، دنیا کی کسی زبان میں نہیں پائی جاتی اس لئے کہ اردو میں دنیا کی تین بڑی اور قدیم زبانوں کے حروف بھی پائے جاتے ہیں اور یہی حروف تہجی (اپنی اردو رسم خط میں) آوازوں کی علامتیں ہیں۔

یہ کتنا سراسر ناانصافی اور کھلی فساد پروری ہے کہ ان علامتوں کی صحیح ادائیگی ہندوستان کے جغرافیائی ماحول میں نہیں ہوتی ہم رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ، عصمت چغتائی صاحبہ، راہی معصوم رضا، اور اردو کے فرقہ پرست دشمنوں سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی سنسکرت زبان کے کتنے الفاظ (وہ جو ہندی میں بھی جوں کا توں استعمال ہوتے ہیں) کا صحیح تلفظ خود ہندوستان کا ہندی داں طبقہ ادا کرتا ہے یا کر سکتا ہے؟ ایسی صورت میں اردو زبان اور اس کی رسم خط کو ہی ہدف تنقید و ملامت بنانا سوائے سیاسی مصلحت پسندی یا فرقہ پرستی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کو ساری دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے۔ یہ فرقہ پرست ذہنیتوں کی سراسر غلط فہمی ہے کہ اردو مغلیہ دربار میں پروان چڑھی نیز یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مغلیہ حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جا رہی تھی اردو اس وقت بہادر شاہ ظفر کی زبان پہ آئی وہی بہادر شاہ ظفر جس نے جنگ آزادی کی تحریک میں سر دھڑ کی بازی لگا دی اور انگریزوں کے طلائی طشت پہ اپنے بیٹوں کے کٹے ہوئے سر دیکھ کر بھی خاموش رہا لیکن اپنے دل کے لہو کو الفاظ کا جامہ عطا کرنے کے معاملے میں اپنی مادری اور سرکاری زبان فارسی کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دی۔ ہماری سرکاری زبان ہندی کے کچھ ہم نوا اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں کہ بھوجپوری، میتھلی، مگہی وغیرہ ان کی مادری زبان ہے لیکن انھوں نے ہندی پہ اپنی مادری زبان کو قربان کر دیا۔ ہم سرکاری زبان سے اپنی تمام عقیدت مندی اور خلوص کے باوصف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر نے فارسی پہ اردو کو ترجیح دی۔ فارسی جو اردو کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی لیکن بھوجپوری، میتھلی اور مگہی آج کی ہندی کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے یہ ہمیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اردو کے خلاف مجہول منطق، سیاسی مصلحت پسندی، تعصب، تنگ نظری اور فسطائیت سے کام لینے والے اردو سے زیادہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں شگاف ڈال کر ملک کے مستقبل کو تاریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس ذہنیت کا اختتام کہاں ہوگا یہ کہنا مشکل ہے۔

آج کے سیاسی ماحول میں یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ رجعت پرست طاقتیں پورے زور و شور کے ساتھ سر اٹھا رہی ہیں اور ان کا زور کم کرنے کے لئے نام نہاد ترقی پسند طاقتیں اردو کو ہی قربانی کا بکرا بنانا چاہتی ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ ایسا کر کے وہ اردو دشمن عناصر کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے

(باقی صفحہ ۵ پر)

مراسلات

گل رعنا کے سلسلے میں

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنے کلام کے متعلق خود فرمایا ہے کہ:

"پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیے۔"

مولانا محمد حسین آزاد نے اس سلسلے میں جو "حقیقت" معتبر لوگوں سے سنی اسے تفصیل کے ساتھ "آب حیات" میں قلمبند کر دیا۔ ماہر غالبیات جناب مالک رام کی رائے ہے کہ:

"یہ افسانہ محض غالب کو مطعون کرنے کے لیے گڑھا گیا ہے یوں تو غالب ساری عمر اپنے کلام میں سے خود ہی ترک و حذف کے اصول پر کاربند رہے لیکن صحیح معنوں میں انتخاب کا کام انھوں نے پہلی مرتبہ کلکتے میں ...... کیا ...... متداول دیوان کا انتخاب بھی خود انھیں کا کیا ہوا ہے"

(گل رعنا، مقدمہ ص ۲۲)

"صحیح معنوں میں انتخاب" اور محض "انتخاب" سے کیا فرق مقصود ہے یہ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ غالب کا دعویٰ ہے کہ پچیس سال کی عمر تک انھوں نے بڑا دیوان جمع کر لیا۔ میرے نزدیک اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں محقق بے بدل جناب قاضی عبدالودود صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کی بابت فرمایا ہے:

"یہ دیوان بہت بڑا (قول آزاد) کیا معنی بڑا بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی زمانے میں بھی اردو دیوان کی ضخامت اتنی نہ رہی ہوگی کہ اسے بڑا کہہ سکیں۔" (معاصر حصہ ۱۲ ص ۲)

میں اپنے ایک مضمون میں عرض کر چکا ہوں کہ نسخۂ حمیدیہ یا نودریافت دیوان، بنیادی طور پر یہ دونوں غالب کے لڑکپن تک کے کلام پر مشتمل ہیں البتہ دونوں کے کاتب نے بقدر وسعت کچھ نئے کلام کا بھی اضافہ کر لیا اگر یہ بات مسلّم ہے کہ لڑکپن تک وہ اتنا کلام جمع کر چکے تھے تو پچیس سال کی عمر تک "بڑا دیوان" جمع ہو جانے میں شک کی گنجائش نہیں۔ اب یہ بڑا دیوان نایاب ہے ظاہر ہے اس کا انتخاب وہ مختصر دیوان ہے جو بعد میں رائج ہوا کن معنوں میں یہ انتخاب نہیں ہے مجھے معلوم نہیں۔

غالب کا کہنا ہے کہ اس منتخب دیوان کے علاوہ جو کچھ تھا اسے اس طور پر مسترد کیا کہ "اوراق یک قلم چاک" کر دیے۔ اور اس کے بعد غالب کے کسی دوست، شاگرد یا عزیز نے اس مسترد کلام کو کہیں نقل نہیں کیا۔ (اس میں بعض مستثنیات کی گنجائش ہے) تذکروں میں بھی بالعموم وہ کلام نہیں ملتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس انتخاب کے بعد غالب نے اس کی طرف سے پورے طور پر صرف نظر کر لیا، انھوں نے تفصیل سے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کام میں کن کن لوگوں نے ان کی مدد کی۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ اس وقت کے معیار و مزاج شاعری سے ان کا وہ کلام ہم آہنگ نہ تھا، ضرورت تھی کہ اس زمانے کے اہل علم حضرات سے رجوع کرتے اور اپنے اس کلام کے انتخاب میں مدد لیتے، اس کام کے لیے کسی شاعر سے رجوع کرنا مناسب نہ تھا اس کے لیے شاہ نصیر، ممنون، ذوق یا مومن بالکل مفید ثابت نہیں ہو سکتے تھے وہ سب غالب کے میدان شاعری کے حریف تھے، صہبائی کے بارے میں غالب کی رائے جو تھی ظاہر ہے آزردہ سے بھی روابط شاید کم تھے (آزردہ نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر تک نہیں کیا)، آزاد کا قول ہے کہ ذوق حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے رجوع کرتے تھے، غالب نے اس دور کے بقول آزاد "فاضل بے عدیل" مولوی فضل حق سے رجوع کیا، یہ بات بالکل سمجھ میں نہ آئی کہ "فاضل بے عدیل" ہونے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ:

"انھیں شعر و سخن سے کیا واسطہ"

اگر اس اصول کے مطابق کوئی شخص جناب امتیاز علی عرشی اور خود جناب مالک رام کے متعلق جو بجا طور پر "فاضل بے عدیل" ہیں یہ کہے کہ "انھیں شعر و سخن سے کیا واسطہ وہ ایک ہمعصر شاعر کے کلام کے انتخاب میں مدد کرنے کے بھی اہل نہیں" تو مجھے یقین ہے کہ اس کا یہ دعویٰ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔ آزاد نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں اتنی بات تو یقینی طور پر صحیح ہے کہ:

۱۔ کلام غالب کا انتخاب ہوا اور
۲۔ کسی دوسرے سے مدد لینا نہ غالب کے لیے ناممکن تھا اور نہ نامناسب۔
۳۔ یہ بات غالب نے تسلیم کی ہے کہ ان کا کلام "عام لوگوں کی سمجھ میں" نہ آئے گا۔
۴۔ مولوی فضل حق اور مرزا خانی کے ساتھ غالب کے روابط تھے۔

آزاد کا کہنا ہے کہ انتخاب میں "مشکل شعر نکال" ڈالے غالب کا بیان ہے کہ "اوراق یک قلم چاک کیے" آزاد نے واقعات کے بیان میں انشا پردازی کے جوہر کم و بیش ہر موقع پر دکھائے

ہیں، ممکن ہے کہ یہ ان کا مبالغہ ہو کہ "مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا" لیکن اس واقعہ کو سرے سے "گڑھا ہوا" قرار دینے کے لئے تو کوئی برعکس شہادت پیش کرنی ہوگی جناب مالک رام نے "گل رعنا" کے متعلق لکھا ہے کہ:

"گل رعنا کا جملہ انتخاب (چند منتخبات سے قطع نظر) جوں کا توں متداول دیوان میں شامل ہے"
(مقدمہ صفحہ ۳۷)

یعنی غالب اس انتخاب میں شامل اشعار کو نسبتاً زیادہ پسند کرتے تھے (اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی کو وہ ناپسند کرتے تھے) اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر غالب اپنے کلام کے اولین انتخاب میں پورے طور پر آزاد ہوتے تو شاید وہ متداول دیوان کے بھی کچھ اشعار کو قلمزد کر دیتے، اگر یہ خیال صحیح ہو تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ منتخب دیوان تیار کرتے وقت انھوں نے اپنے بعض نہایت قریبی دوستوں سے (وہ ایک ہو یا زاید، مولوی فضل حق اور مرزا افغانی بیگ ہوں یا کوئی اور) مشورہ کیا تھا، پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے غالب کے طریقہ انتخاب کے متعلق لکھا ہے:

"دوستوں کے لئے انتخاب کرتے وقت وہ ان کے مذاق کے لحاظ سے یا وقتی حالات کے مطابق انتخاب کرتے تھے"

(ہماری زبان ۲۲ر فروری ۱۹۷۱ء)

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات عین مطابق فطرت ہے کہ جو چیز جس کے لئے تیار کی جائے وہ اس کی پسند اور مزاج کے مطابق بھی ہو، غالب نے بھی کہا ہے کہ

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اس کا امکان بھی ہے کہ متعلق افراد نے براہ راست یا بالواسطہ، صراحتہً یا محض اشاروں میں یا ضمناً اپنی پسند کے اشعار سے بھی غالب کو مطلع کر دیا ہو اور غالب نے اپنی خصوصی پسند کے کلام کے ساتھ ساتھ متعلق شخص کی پسند کے اشعار کو بھی انتخاب میں جگہ دے دی ہو۔

"گل رعنا" دیوان غالب کا پہلا انتخاب ہے چنانچہ اس کی بابت انھوں نے لکھا ہے کہ:

"منتخبی از دیوان ریختہ و غزلی چند از پارسی در یک سفینہ باہم در آمیزم...... و نام این سفینہ بزبان ادا شناسان گل رعنا" (دیباچہ صفحہ ؟)

"گل رعنا" کے نسخہ لاہور کی کتابت غالب کے ورود کلکتہ کے تقریباً آٹھ مہینے بعد مکمل ہوئی تاریخ تکمیل غرۂ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ ہے کتابت کا آغاز اس تاریخ سے پہلے ہوا ہوگا۔ اگر یہ خیال کریں کہ غالب نے اس انتخاب کا کوئی مسودہ بھی تیار کیا تھا تو یہ کہا جانا چاہئے کہ انھوں نے کلکتہ پہنچنے کے فوراً بعد اس کلام کو شروع کر دیا ہوگا۔ اس کتاب کی نقلیں کب اور کس کس نے تیار کیں یہ بات ہمارے علم میں نہیں ہے۔ نسخہ مالک رام نسخہ لاہور کی براہ راست نقل ہے یا نہیں اس کا اندازہ ذیل کے امور سے کیا جا سکتا ہے:

(۱) نسخہ مالک رام میں درج ذیل عنوان ہے لیکن نسخہ لاہور میں نہیں ہے:

صفحہ ۶ لا موثر فی الوجود الا اللہ

(۲) نسخہ لاہور میں درج ذیل شعر زائد ہیں:

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا
(اسی زمین میں چار شعر اور بھی)

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
(اس غزل کے آٹھ اشعار مزید)

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

(۳) دونوں نسخوں کے متن میں جو اختلاف ملتا ہے اس کی دو مثالیں درج کی جاتی ہیں:

شعر نمبر	نسخہ مالک رام	نسخہ لاہور
۲۰۸	تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں	تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
۹	فغاں کہ سوخت غم و بردم آنچناں کہ یک زہم بریزم اگر بگرہ ہم بجتابی	فغاں کہ جان جنت داوم و تو دانستی کہ جاں دہند دغا پیشگاں بآسانی

یہاں سرسری طور پر کچھ اختلافات پیش کئے گئے ہیں صحیح یہ ہے کہ دونوں نسخوں میں اس حد تک فرق ہے کہ یہ یقین کرنا نہایت مشکل ہے کہ ایک دوسرے کی نقل ہے چنانچہ مالک رام صاحب کا یہ خیال کہ ان کا "نسخہ شوال ۱۲۴۴ھ (یعنی نسخہ لاہور کے کم و بیش آٹھ ماہ بعد) کا کتابت کردہ ہے" صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ترقیمہ میں کاتب نے سنہ نہیں لکھا ہے۔ اس بابت مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ:

"سال تحریر کی عدم تکمیل غالباً نتیجہ ہے کاتب کے سال ہجری سے ناواقفیت کا وہ چاہتا تھا کہ اسے بعد کو مکمل کرے لیکن اسے اس کا موقع نہ ملا ۱۲ سنہ کا لکھنا اور بقیہ خالی چھوڑ دینے کی اور کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی" (مقدمہ صفحہ ۲۰)

اس سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور نے بالکل صحیح لکھا ہے:

"مالک رام صاحب کا یہ کہنا میرے نزدیک ماننے کے قابل نہیں اس زمانے میں عام طور پر ہجری سنین ہی رائج تھے کیا ہی کاتب ہو ہجری سنین سے ضرور واقف ہوگا"

(ہماری زبان ۲۲ر فروری ۱۹۷۱ء)

علاوہ اس کے کہ جس زمانے کا مکتوبہ یہ نسخہ فرض کیا جا رہا ہے اس وقت ہجری تاریخیں ہی لکھی جاتی تھیں اور کاتب کا اس سے واقف ہونا عام طور پر متوقع ہوتا تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس نسخے کے کاتب کو تاریخ بھی معلوم ہے، مہینہ بھی معلوم ہے وہ صرف سال سے ناواقف ہے۔ یہ بات تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی غلطی یا بھول تاریخ کے بارے میں ہو سکتی ہے سنہ کے بارے میں نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کاتب نے ترقیمہ میں دن بھی نہیں لکھا ہے ورنہ معاصر شہادتوں سے کم از کم ممکن سنوں کا تو قیاس کیا ہی جا سکتا تھا۔ جناب مالک رام نے اپنے قلمی نسخے کے کسی صفحے کا نہ عکس شائع کیا اور نہ کاتب کے انداز خط سے تفصیلی بحث کی ہے اس لئے اس سلسلے میں کوئی قطعی بات کہنا ممکن نہیں، فی الحال میرا خیال ہے کہ اس نسخے کے سال کتابت کے سلسلے میں کسی توجیہ کی ضرورت نہیں ہے اس میں سنہ ہجری لکھا ہے چنانچہ اسے ۱۲۰۶ھ ہی تسلیم کرنا چاہئے۔ ۱۲۱۲ھ میں غالب پیدا ہوئے تھے اس سال میں نسخے کے کتابت ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا اس لئے اسے ۱۳۱۲ھ سمجھا جائے۔ کاغذ، روشنائی اور سواد خط سے اگر یہ قدیم تر ثابت ہو سکے (اس بابت ہنوز کوئی تفصیل سامنے نہیں آئی ہے) تو کسی قدیم سال میں اس کے لکھے جانے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ جناب مالک رام نے فرمایا ہے اس سے نسخہ بہت زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا مثلاً اس پر "ترک" کا التزام ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا البتہ یہ بتایا گیا ہے کہ صفحات پر اعداد شمار درج ہیں وغیرہ۔

علی گڑھ۔ محمد انصار اللہ

ظ انصاری کے استفسار کا جواب

(۱)

جناب ظ انصاری صاحب کے استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ "دزد و بردزد اد فتاد" کی پھبتی کیتی نے اپنے ہمعصر کمال الدین غوث پر اڑائی تھی، کمال خجندی کا اس سے کوئی سروکار نہیں اور نہ یہ اس کے متعلق کہی گئی تھی۔ پوری ہجو یہ ہے

گر حسن معنی زخرو بردد نتواں کرد منع

زانکہ استادست خرو بلکہ ز استاداں زیاد

در معانی حسن را بردہ از دیوان کمال

ہیچ نتواں گفتن او را دزد و بردزد اد فتاد"

اس میں حسن بے چارے کو بھی معاف نہیں کیا گیا وہ بھی چوروں کے گروہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

"صحبت کمال خجندی بہ از شعر وے و شعر حافظ شیرازی بہ از صحبت او"

یہ یقیناً کمال خجندی سے متعلق ہی کہا گیا ہے۔ جامی کمال کا عقیدت مند تھا۔ وہ اسے ولی اللہ نہیں بلکہ فنا فی اللہ سمجھتا تھا اس کا خیال تھا کہ کمال اپنی روحانی عظمت کو چھپانے اور خدا کے ساتھ اپنی اطاعت کو قائم رکھنے کے لئے شعر کہتا تھا۔ جیسا کہ اس کے اس شعر سے ظاہر بھی ہے۔

این تکلفہائے من در شعر من
کلمینی یا حمیرائی من است

جامی کمال کے متعلق یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی وفات پر اس کے گھر سے صرف ایک بوریا نکلا جس پر وہ بیٹھا کرتا تھا اور ایک اینٹ جو وہ سوتے وقت سرہانے رکھا کرتا تھا۔ ایسے بزرگ کے لئے جامی کا یہ کہنا کہ اس کی صحبت اس کی شاعری سے بہتر تھی کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

امرتسر ۔ ابراہیم باقر دت

(۲)

جناب ظ۔ انصاری صاحب اگر ایرانی محقق ڈاکٹر محمد معین صاحب کے بیان کو نظر انداز کر دیں۔ تو بے جا نہ ہوگا۔ محقق صاحب کا یہ کہنا کہ "حافظ کے پائے کا شاعر بھلا کیوں ہندوستان کے فارسی شاعر کا کلام نقل کرتا" کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یہ ان کی اپنی تنگ نظری کا ثبوت ہے۔

جامی ایک بڑے ایرانی شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً ۵۰ کتابیں لکھیں ان کا ثانی ایران آج تک پیدا نہیں کر سکا۔ ان کی انا اتنی بلند تھی کہ وہ اپنے استادوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور اپنے کو ان سے افضل سمجھتے تھے۔ وہ اپنی کتاب "تحفۃ الاحرار" میں لکھتے ہیں کہ یہ خسرو کی تصنیف لطیف "مطلع انوار" کی تقلید و پیروی میں لکھی گئی ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ "لیلیٰ و مجنوں" میں "در ہند چو طوطی [illegible] شکر ریز" کہہ کر انھیں سربلند کرتے ہیں۔ اپنی مشہور [illegible] "نے نامہ" بھی کہتے ہیں، انھیں کے شعر سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ پھر بھلا محمد معین صاحب کی بات کون باور کرے گا۔ وہ جو کہتے ہیں انھیں کہنے دیجئے پرواہ نہ کیجئے۔

اب تو غالب کی فارسی شاعری کی بھی ایران میں قدر ہو رہی ہے اور اقبال کو بھی انھوں نے فارسی گو شاعروں کے زمرہ میں لے لیا ہے۔ محقق صاحب ہندوستان کو اس کے اصلی مقام سے کسی طرح محروم کر سکتے ہیں۔

ابراہیم باقر دت

لہ پہلا مصرعہ یہ ہے
"از گنجہ چو گنج آں گہر ریز"
یہ نظامی کے لئے کہا گیا ہے۔

انجمن کی خبریں

انجمن ترقی اردو کوئٹہ کا جدید انتخاب

کوئٹہ :- انجمن ترقی اردو کوئٹہ کی انتخابی میٹنگ بر مکان ڈاکٹر عبدالوحید صاحب منعقد ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت جناب اے ایم۔ اختر صاحب ایڈووکیٹ وائس پریسیڈنٹ انجمن ترقی اردو نے کی۔ اس جلسہ میں انجمن کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ انتخابی کارروائی کے اختتام پر جناب پروفیسر حافظ حکمت علی صاحب صدر انجمن ترقی اردو کوئٹہ و جناب مولوی احترام الدین صاحب شاغل جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو راجستھان کی وفات پر تعزیتی تجاویز منظور ہوئیں۔ انتخاب میں حسب ذیل عہدیداران منتخب ہوئے۔

صدر، جناب اے۔ ایم۔ اختر (علیگ) ایڈووکیٹ۔
نائب صدر، جناب الحاج عبدالصمد صاحب۔
جنرل سکریٹری، جناب سلطان احمد صاحب۔
سکریٹری: جناب ڈاکٹر محمد علیم خاں (علیگ)
خازن، جناب حاجی ڈوڈم صاحب۔ • انجمنیہ

جشن جمہوریہ

یوم جمہوریہ کے سلسلہ میں ہیوی الیکٹریکلس (انڈیا) لمیٹڈ بھوپال کی جانب سے ایک نمائش کے موقع پر انجمن ترقی اردو ایچ۔ ای۔ ایل۔ بھوپال نے بھی ادبی کتابوں پر مشتمل ایک شاندار اسٹال لگایا تھا۔ اسٹال کی سجاوٹ مندرجہ ذیل عنوانات پر کی گئی تھی۔

۱۔ منشی پریم چند سے کرشن چندر تک۔ اس میں افسانہ نویسی میں اردو کا مقام دکھایا گیا تھا۔

۲۔ آزادی کی جد و جہد میں اردو ادب۔ اس میں آزادی کے سلسلے میں جو بھی قومی نظمیں کہی گئیں ان کو اچھے پیرائے میں پیش کیا تھا۔

۳۔ اردو زبان اور ہندو شعرا۔ یہ عنوان خاص طور سے ادبی نقطۂ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے کافی دلچسپ تھا۔

۴۔ اردو کے غیر ملکی شعرا۔ اس میں غیر ملکی انگریز شعرا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوران یہاں قیام پذیر رہے ان کی غزلیات کو عوام کے سامنے روشناس کرایا گیا۔

اس کے علاوہ موجودہ دور کے شعرا حضرات کے تلمی چہرے اور ان کے کلام کو ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں پیش کیا گیا تھا۔ اس اسٹال میں مردم شماری کے سلسلے میں بھی ایک گوشہ سجایا گیا جس میں "ہماری زبان" اخبار سے ماخوذ بیانات عوام کے سامنے پیش کئے گئے اور مردم شماری کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔

• ایس۔ ایم۔ پاشا

منشی دودھ ناتھ لال صاحب کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

انجمن ترقی اردو بنارس کے ایک ہنگامی اجلاس میں جناب منشی دودھ ناتھ لال صاحب کے انتقال پر ملال پر ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی جس میں دلی رنج و غم کے اظہار کے ساتھ ان کی روح کی شانتی کے لئے پرارتھنا کی گئی اور ان کے پسر بابو شیو ناتھ پرشاد موجودہ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس اور دیگر پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

قرارداد میں کہا گیا کہ منشی جی موصوف ایک خدا ترس و مرنجان مرنج انسان تھے۔ موصوف کو اردو و فارسی ادب پر کافی عبور تھا ان کے اٹھ جانے سے شہر دارانس کے اردو و فارسی داں طبقہ میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔

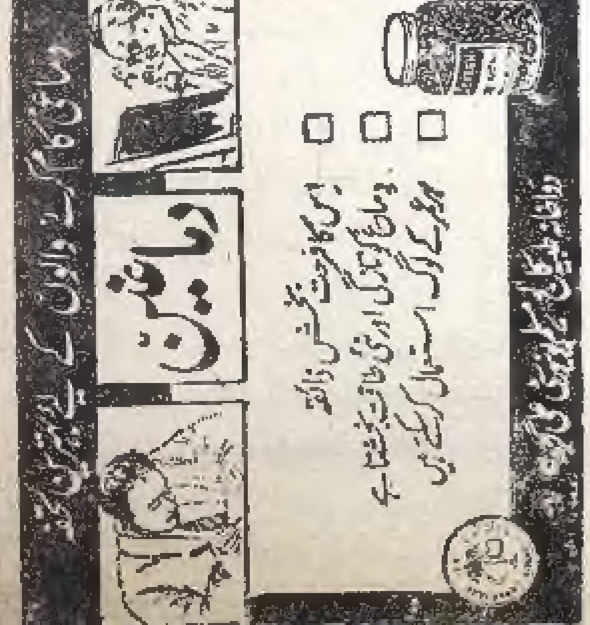
• • داتا رسول سکریٹری انجمن ترقی اردو بنارس

یوم غالب ۱۹۷۱ء

انجمن ترقی اردو (ہند) دلی کی جانب سے حضرت غالب کو حسب معمول خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

پروگرام کی ابتدا مزار غالب پر گلپاشی اور فاتحہ خوانی سے ہوئی، پھر درگاہ کے قوالوں نے مرزا کی غزلیں پیش کر کے سماں باندھ دیا۔ جلسے کا افتتاح عالی جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں غالب کے کلام کی صوری اور معنوی خوبیوں کا بڑے دلکش انداز میں نقشہ کھینچا اور اس عظیم شاعر کی فنی صلاحیتوں کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا۔ شعرائے کرام نے غالب کی مختلف طرحوں میں غزلیں عطا فرمائیں۔ جن شعرا نے حصہ لیا ان میں حسن نعیم، علیم اختر، مظفر نگری، طالب دہلوی، شفیق بریلوی، بہار برنی، خار دہلوی، ضیا فتح آبادی، اصغر احمد صوفی، ہیرا لال فلک اور ڈی راج کنول شامل تھے۔

• • آتا رسول جنرل سکریٹری



صفحہ ۱۲ سے آگے

بیٹے کی نجات دہندہ (REDEEMER) کی اور روح القدس کی فیضان بخش (INSPIRER) کی۔ لیکن یہ تینوں اکثر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہتے ہیں۔ بلیک نجات کا تو قائل ہے، مگر کفارے (ATONEMENT) کا عام تخیل اس کے لئے بہت ناپسندیدہ ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کا مصلوب کیا جانا (CRUCIFIXION) اس کے نزدیک محض ایک نجی واقعہ نہیں۔ اس کی حیثیت تاریخی عمل سے زیادہ ایک ہمہ گیر، لازمانی مظہر کی سی ہے، یعنی یہ ایک تخیلی پیکر ہے اس روحانی بصیرت کا جو عالم آب و گل میں مقید و محصور ہو گئی ہے اور اس طرح یہ واقعہ زوال یافتہ کائنات کا ایک استعارہ ہے۔ اس طرح گویا موت کے وسیلے سے وجود کا اثبات عمل میں آتا ہے۔ بلیک کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر ایک طرف موسوی مذہب میں خدا کی ماورائیت (TRANSCENDENCE) پر زور دیا گیا ہے تو عیسائیت میں اس کے محیط کل (IMMANENT) ہونے پر اور اس لئے وہ تمام طور پر موخر الذکر سے ہمدردی محسوس کرتا ہے اسی طرح وہ ان دونوں مذاہب کے درمیان تفریق اس بنا پر بھی کرتا ہے کہ اول الذکر قانون کی پاسداری کرتا ہے اور موخر الذکر محبت کا پرچار کرتا ہے۔ بلیک ہر حال میں منکر قانون اخلاقی (UNTINOMIAN) ہے اور اس لئے مذہب کا پر زور حامی ہونے کے باوجود وہ کلیسا کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر وہ ضابطہ اور نظام اقدار جو انسانی شخصیت پر باہر سے عائد کیا جائے اور انسان کو سپردگی پر مجبور کرے اور اس طرح اس کی اندرونی قوتوں اور جبلتوں کے ساتھ انصاف نہ کرے، بلیک کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ عیسوی تعلیمات میں بلیک کے لئے رحمت (GRACE) کے تصور سے بھی زیادہ عفو اور درگذر کے تصور کی اہمیت ہے۔ موسوی مذہب کے سزا اور جزا کے تصور سے جگہ جگہ اس کا مقابلہ کر کے اس نے عیسائیت کی برتری ظاہر کی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی ذکر کرنے کے قابل ہے کہ حضرت مسیح کی شخصیت کے سلسلے میں اس کا تصور مروج عقیدے سے بہت مختلف ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے حضرت مسیح کو اپنی شبیہ کے اندر ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس نے ان کی منکسر المزاجی سے زیادہ ان کی قانون شکنی کو اہمیت دی ہے۔ عفو و درگذر پر زور دیا ہے۔ انھیں تخلیقی توانائی کا مظہر قرار دیا ہے یعنی اس شاعرانہ فطانت (POETIC GENIUS) یا تخیل کا مجسمہ بتایا ہے، جو بلیک کے نزدیک علم کا صحیح عرفان بھی بخشتی ہے اور تاریخی حوادث کے بطن میں لازمانی اور عالمگیر (ARCHETYPAL) حقیقت کا انکشاف بھی کرتی ہے۔ بلیک کے نزدیک حضرت مسیح اور ان کے پیرو دنیا کے سب سے بڑے فنکار ہیں۔ مذہب اور فن میں اس لحاظ سے جو چیزیں مشترک ہیں وہ ہیں دروں بینی، اشیا کے تجزیاتی مطالعے کے برعکس ان کا تخیلی عرفان، نفس یا انیغو پر فتح، زندگی کی فراوانی کو خیر اور حسن کو حاصل کرنے کے کام میں لانا اور مابعد الطبیعیاتی موضوعات یا انسان اور حقیقت مطلقہ کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی کوشش۔ لیکن بلیک نفس کشی (ABSTINENCE) کا قائل نہیں اور یہ بات دلچسپ ہے کہ اس خاص معاملے میں اس نے اسلام کو عیسائیت پر ترجیح دی ہے۔

اس طرح بلیک پاکیزہ حمل (VIRGIN CONCEPTION) کے تصور کو قابل قبول نہیں سمجھتا کیونکہ یہ فطرت کے قانون کی نفی کرتا ہے۔ وہ حضرت مسیح کو انکسار کا مجسمہ نہیں سمجھتا جیسا کہ عام عیسائی عقیدہ ہے۔ بلکہ اس کی رائے میں ان کی شخصیت میں غیظ و غضب (WRATH) اور محبت کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے، جو منفرد ہے اور اس کے لئے بلیک نے ٹائیگر (TIGER) اور لیمب (LAMB) کے دو استعارے استعمال کئے ہیں۔ ایسے تضادات کا تصور جو ایک دوسرے کی نفی نہ کرتے ہوں، بلکہ ایک کلی حقیقت کے حصول کا وسیلہ بن سکیں، بلیک نے جرمن مفکر (JACOB BOEHME) سے لیا تھا۔ قانون شکنی کی وجہ سے بلیک نے حضرت مسیح کو ایسے انسانوں کے زمرے میں رکھا ہے جنھیں وہ (REPROBATE) کی اصطلاح سے موسوم کرتا ہے اور جو انسانوں کی دوسری جماعت سے جنھیں وہ (ELECT) کہتا ہے، مختلف ہیں۔ بلیک نے اپنی نظموں میں کثرت سے ایسے استعارے اور تلمیحات استعمال کی ہیں جو براہ راست انجیل مقدس سے لی گئی ہیں۔ اور ہر چند اس کے عیسائیت کے تصور پر اس کے اپنے خاص رویّے کی چھاپ جگہ جگہ نظر آتی ہے، مگر عیسائیت میں اس کے گہرے عقیدے کے بارے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ بیرونی ڈھانچہ ہے، جس کے ذریعے اس نے اپنی بصیرتوں کو منتقل کیا ہے۔ اگر ہم بلیک کے یہاں مستقل بنیادی عیسائی اسطور (MYTH) کو بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اجزائے ترکیبی تکوین، ہبوط، نجات اور (APOCALYPSE) ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

انگریزی ادب میں شیکسپیئر کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا شاعر اٹھارویں صدی کے آخری دور کے شاعر ولیم بلیک کی برابری کر سکے۔ گذشتہ چند برسوں میں اس کے کلام پر نقد و نظر کا جو سرمایہ سامنے آیا ہے اور اس کی شاعری اور مصوری کے نمونوں کو جتنے مختلف پہلوؤں سے جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ وہ اپنی جگہ حیرت انگیز ہے۔ دراصل اس کے شعری اور نثری کارنامے اور اس کی مصوری ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں اور ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اور اس تعلق کو سمجھے بغیر بلیک کی نظانت کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ بلیک کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس کے یہاں بغایت لامرکزیت پائی جاتی ہے، اور اس کا تعلق روایت سے بالکل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بلیک کے یہاں حد درجے کی انتخابیت (ECLECTICISM) پائی جاتی ہے، اور جن ذہنی اور روحانی سرچشموں سے اس نے اکتساب فیض کیا ہے، گو وہ اس کے اپنے زمانے میں کچھ ایسے غیر معروف نہیں تھے، لیکن ہمارے آج کے تاریخی نقطۂ نظر سے وہ خاصے پراسرار معلوم ہوتے ہیں۔ ان تمام مغالطوں کی کلید ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا وہ مشہور جملہ ہے جو اس نے ۱۹۲۰ء میں بلیک پر اپنے مضمون میں استعمال کیا تھا یعنی بلیک کے فلسفے کو ہم اسی حد تک قابل احترام سمجھتے ہیں، جیسے ماہرانہ خانہ ساز فرنیچر کے کسی جزو کو۔ اس سلسلے میں چار امور خاص طور پر قابل غور ہیں، اول بلیک کے خیالات کے پراسرار (OCCULTIST) ماخذ دوسرے ان خیالات کے آپس کے تناقضات تیسرے اس کا مخصوص اور نجی اساطیری نظام اور چوتھے اس کا مروجہ اقدار کی قلب ماہیت اور اس مکبوئے تجربہ کے متضاد پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لئے طنز یعنی (IRONY) جیسے فنی وسیلے کا استعمال۔ آخر ضرور اس کا متقاضی ہے کہ ہم اس کے شعری بیانات کو ان کے سطحی مفہوم کی روشنی میں نہ لیں بلکہ اس کے پورے کارنامے کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کریں۔

یوں تو بلیک نے ایسے مختلف اور متنوع سرچشموں سے فیضان حاصل کیا ہے، جیسے جرائی متصوفانہ نظام، غناسطیت (GNOSTICISM)، جرمن مفکر بوھمے (BOEHME)، سویڈش نژاد، سویڈن بورگ (SWEDENBORG)، نشاۃ ثانیہ کا فلسفی کی تحقیقات (PARACELSUS)، انگلستان کی قدیم تاریخ کے بارے میں JACOB BRYANT، نو افلاطونی فلسفی اٹھارویں صدی کی جمالیات، مگر دراصل اس کے خیالات کی اساس عیسائیت کی تعلیم اور حضرت مسیح کی شخصیت پر قائم ہے۔ بلیک اپنے عقائد کے اعتبار سے باغی اور ان کے اظہار میں انتہائی غلو سے کام لیتا تھا، عیسائیت کے چوکھٹے کے اندر رہتے ہوئے وہ کیتھولک کی بجائے پروٹسٹنٹ تھا۔ اور اسی لئے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس کے خیالات میں توازن اسی وقت پیدا ہو سکتا تھا۔ اگر کیتھولک روایت سے اس کا تعلق گہرا اور استوار ہوتا۔ بلیک ہر اعتبار سے انفرادیت پسند تھا اور ہر مسئلے کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا تھا۔ وہ بنیادی اعتبار سے عقلیت پسند تھا۔ اور اس کی مابعد الطبیعات اس کی اپنی تراوش ذہنی کا نتیجہ تھی۔ تکوین کائنات کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ ہبوط آدم کے بعد وجود میں آئی اور ایک طرح سے زوال اور انتشار کی علامت ہے۔ دراصل فلاطونیوں کی طرح اس کا بھی عقیدہ تھا کہ انسان کا اصلی اور اولین گھر ازلی اور ابدی کائنات (INFINITUDE) ہے، جب اس مکمل وجود سے انسان کا تعلق منقطع ہوا، تو زمان و مکان کی کائنات ظاہر ہوئی، جو غیر حقیقی بھی ہے اور محدود و متعین بھی۔ لیکن اس انقطاع تعلق کے اسباب وہ نہیں ہیں، جو مروجہ عیسائیت نے بتائے ہیں۔ ہبوط کے اسباب یوں تو بہت سے ہیں، لیکن بلیک نے خاص طور پر نفسیاتی انداز سے جو توجیہہ اس کی پیش کی ہے وہ غور طلب ہے۔ انسانی شخصیت کا نظم چار بنیادی اجزاء سے مرکب ہے یعنی تخئیل، عقل، جذبات اور جبلتیں۔ جب ان کے درمیان توازن بگڑ جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر کوئی ایک عنصر دوسرے عناصر پر تحکمانہ اقتدار اور تفوق اور برتری حاصل کر لیتا ہے تو ایک انتشار کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی ہبوط آدم کا سبب ہے۔ بلیک نے اس تصور کو جو نشاۃ ثانیہ کی صلاحیتی نفسیات (FACULTY PSYCHOLOGY) پر مبنی ہے، اشارتی پیکروں میں ڈھالا ہے اور تواتر کے ساتھ اس سے کام لیا ہے اسی طرح گو بلیک تثلیث (TRINITY) میں عقیدہ رکھتا ہے مگر خدا، بیٹے اور روح القدس کے علیحدہ علیحدہ تشخص کا اس طرح قائل نہیں، جیسے ایک عام عیسائی عقیدہ رکھنے والا۔ خدا کی حیثیت اس کے نزدیک خالق (CREATOR) کی ہے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔ اے نے مسلم کلچرل پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2185/57